قرآن کا پیغام

خرّم مُرادؒ

منشورات

00061 / 10

جملہ حقوق محفوظ

قرآن کا پیغام از خرم مرادؒ
جنوری ۱۹۹۷ء _ تعداد: ۲۰۰۰ _ کوڈ: 00061 _ **قیمت**: ۱۰ روپے
ناشر: **منشُورات**، منصورہ، لاہور۔ ۵۴۷۹۰ _ **مطبع**: جے کیو پریس، بند روڈ، لاہور۔
فون: 35252211 _ فیکس: 042-35252210 _ ای میل: manshurat@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ساری عظمت اور بزرگی صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام کے لیے ہے۔قرآن مجید اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے، جو اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی۔ہم مسلمان بڑے خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے یہ نعمت ہمارے سپرد فرمائی ہے۔اس نعمت کی متبادل، دُنیا کی کوئی اور نعمت نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ اس بارے میں خود فرماتا ہے: ''اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ نصیحت ہے جو ان سارے امراض کے لیے شفا ہے، جو تمھارے سینوں اور دلوں میں پائے جاتے ہیں۔ جو اس کتاب کو مان لیں، یہ انھیں راستہ بتاتی ہے اور ان پر رحمت کی راہیں کھولتی ہے۔'' قرآن پاک میں ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَخَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ o

(یونس ۱۰:۵۸)

اے نبی ﷺ، کہو کہ ''یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اُس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے، یہ اُن سب چیزوں سے بہتر ہے جنھیں لوگ سمیٹ رہے ہیں''۔

قرآن مجید سے زیادہ بڑی کوئی نعمت ایسی نہیں ہے، جو خوشی، مسرت اور جشن کی مستحق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری خوشی کے سب سے بڑے دن کو قرآن مجید کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ قرآن مجید کی نعمت سے منسوب کر دیا ہے۔ روزے رکھے جاتے ہیں اور راتوں کو قیام ہوتا ہے۔ مسجد مسجد قرآن مجید کی تلاوت سے معمور، ایمان

پرور محفلیں آراستہ ہوتی ہیں اور جب رمضان کا مہینہ ختم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: **فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا** ،اگر جشن منانا ہے اور خوشیاں منانا ہیں، تو وہ یہی ایک نعمت ہے،جس پر کہ شکر ادا کرنا چاہیے:

وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ o

(البقرۃ ۲:۱۸۵)

تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

اسی لیے جب رمضان کا مہینہ ختم ہوتا ہے،تو مسلمانوں کی زبانوں پر، **اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر ، لاالٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ ،اکبر وللّٰہ الحمد** کا ایمان پرور نغمہ جاری ہو جاتا ہے۔ یہ تکبیر کس بات کی تکبیر ہے؟ یہ اللہ کی کبریائی کا بیان کس لیے ہو رہا ہے؟ یہ حمد اور شکر کا ترانہ کس چیز کے لیے گایا جارہا ہے؟ یہ قرآن مجید کے لیے ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دوسری عید کس لیے ہوئی؟ دوسری عید بھی دراصل قرآن مجید کے لیے ہی ہے۔ رمضان کا سوچتے ہی ذہن میں روزوں کا تصور آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ رمضان کی یہ ساری عظمت قرآن ہی کی وجہ سے ہے۔عید بھی اسی لیے ہے کہ قرآن مجید کا جشن منایا جائے۔ یہ نزولِ قرآن کی سالگرہ ہے، جو سارا عالمِ اسلام مناتا ہے۔ دوسری عید کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت ہے: ''ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمھاری کتاب میں ایک آیت ایسی ہے، کہ اگر یہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو اپنا یومِ عید بنا لیتے۔ پوچھا: وہ آیت کون سی ہے؟ کہا کہ وہ آیت ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِ سْلَامَ دِيْنًا ط (المآئدۃ ۵:۳)

آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے

اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ اس وقت کہاں موجود تھے؟ یہ عرفہ کا دن تھا، عرفات کا میدان تھا، حج کا دن تھا اور عیدِ قربان سے ایک دن پہلے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اگر غور کیا جائے تو پہلی عید نزولِ قرآن کے آغاز کی سالگرہ ہے اور دوسری، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے مکمل ہو جانے کی خوشی کے اظہار کا دن ہے۔

قومیں اپنے تہوار ان چیزوں کا شکر ادا کرنے کے لیے مناتی ہیں، جن کے ساتھ ان کی اجتماعی زندگی کا پورا وجود اور تشخص وابستہ ہوتا ہے۔ عیسائی سمجھتے ہیں کہ ان کی ملت کا وجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دم سے قائم ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق، وہ ان کی پیدائش کے دن، ان کے مصلوب ہونے کے دن اور ان کے دوبارہ جی اٹھنے کے دن کو، عید کے طور پر مناتے ہیں۔ یہودی سمجھتے ہیں کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے ان کو فرعون کے جبر و تسلط سے آزادی دلا کر دریائے نیل پار کرایا، وہ دن ان کے لیے عید کا دن ہے...... لیکن مسلمانوں کے نزدیک اگر کوئی شخص ایسا تھا، جس کی زندگی عید کی مستحق ہو سکتی تھی تو اس ہستی سے بڑھ کر کون سی ہستی تھی کہ جو اللہ کا آخری نبی ﷺ ہے، جو رحمت للعالمین ﷺ ہے، جو خدا کا حبیب اور بندوں کا محبُوب ہے۔ لیکن اللہ نے اپنی کتاب کے نزول کے دن ہی کو خوشی اور جشن کا دن قرار دیا۔

کچھ قومیں عید اس وقت مناتی ہیں جب موسمِ سرما کی طویل تاریک راتیں گزرنے لگتی ہیں، اور بہار کے خوشگوار دن آنے لگتے ہیں، کونپلیں پھوٹتی ہیں اور سبزہ نکلتا ہے۔ کہیں ''نوروز'' اور کہیں ''بسنت'' کا تہوار منایا جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اس گھڑی کو یوم جشن قرار دیا، جب ظلم و بربریت، جہالت اور جھوٹے خداؤں کی غلامی کی تاریک رات چھٹ گئی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور توحید کا آفتاب انسانوں کے سامنے طلوع ہوا۔ ان غلامیوں کی زنجیریں توڑ کر جب ایک اللہ کی اطاعت کا شعور بیدار ہوا تو انسان نے عدل،

احترام، مساوات، امن اور آزادی کے نئے موسمِ بہار کی دُنیا میں قدم رکھا۔

یہ چیز اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اس اُمت کو بنانے والے خالق کے نزدیک، اس اُمت کی پوری زندگی جس سے چیز وابستہ ہے، وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس اُمت کا تشخص، اس کا وجود، اس کی زندگی، اس کا عروج و زوال، اس کی بلندی اور پستی، اس کی خوش حالی اور پسماندگی، یہ سب کا سب اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ کوئی شاعری نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی چودہ سو سال کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے۔ یہی حقیقت ان کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

مسلمانوں نے جب بھی اس کتاب سے رشتہ جوڑا، وہ دُنیا میں معزز، سربلند اور خوش حال ہوئے۔ اور جب انھوں نے اس کتاب سے رشتہ توڑا تو وہ دُنیا میں ذلیل، پسماندہ اور مفلوک الحال ہوئے۔ دورِ اول کو لیجیے یا اس کے بعد آنے والے ادوار کو دیکھیے، تاریخ اپنے آپ کو اسی طرح دہراتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ دُنیا کی حکومت عربوں کے ہاتھ میں آئے یا ترکوں کے ہاتھ میں چلی جائے، اقتدار عباسیوں کے ہاتھ میں آئے یا عثمانیوں کے پاس رہے، سلجوق تخت پر بیٹھیں یا مغل حکومت کریں، حق تعالیٰ کی سنت میں اسے کوئی اہمیّت حاصل نہیں۔ اس لیے کہ جب قرآن مجید نازل ہوا، اقتدار اور حکومت کے آنے جانے کا یہ عمل تو اس وقت بھی برابر جاری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے سائے میں کوئی اُمت مبعوث کی تو اس لیے کہ وہ اس خالق و مالک کے پیغام کی علم بردار اور ہدایت کی حامل بنے۔ اس کی امانت دار بنے اور اس کا بوجھ اٹھائے۔ خود اس پر عمل کرے اور دُنیا کے سامنے گواہ بن کر کھڑی ہو۔

اس اُمت کی زندگی میں مرکزی حیثیت اس دن کو حاصل ہوئی جس دن غارِ حرا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے سپرد اس کتاب کا پہلا پیغام کیا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً یہ پیغام نازل ہوتا رہا...... وہ پیغام جو صرف ایک شخص کی زبان سے جاری ہوا تھا اور جس پر لبیک کہنے

والے مٹھی بھر لوگ تھے، جو غلام، کمزور اور غریب تھے، جو عرب کے بڑے بڑے سردار یا بہت پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں تھے، جن کے پاس نہ دولت کے ڈھیر جمع تھے اور نہ سرداری کے تاج ان کے سروں پر سجے ہوئے تھے۔ اس پیغام کی پہلی پکار پر بس یہی مٹھی بھر لوگ جمع ہوئے تھے۔ تب کون کہہ سکتا تھا کہ غارِ حرا سے بلند ہونے والی یہ آواز، چند ہی برسوں میں دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجے گی۔ اس پیغام کو خلوصِ نیت اور خلوصِ عمل سے ماننے والے افراد، دُنیا کے امام اور لیڈر بن جائیں گے۔

مکی زندگی کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے: خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ایک بے کس غلام تھے۔ وہ ایمان لائے تو ان کا آقا ایمان لانے کے جرم میں انھیں باندھ کر آگ کے انگاروں پر لٹاتا تھا اور اُن کی پیٹھ کی چربی کے پگھلنے سے دہکتے انگارے بجھ جایا کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس حالت میں، میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے کہا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مظالم کی حد ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے دُعا کیجیے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے خانہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ یہ بات سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اس طرح سرخ ہو گیا جیسے کسی نے انار کے دانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر نچوڑ دیے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''اے خباب رضی اللہ عنہ! تم سے پہلے جن لوگوں کو یہ امانت دی گئی تھی، ان کو ہر طریقے سے ستایا گیا، یہاں تک کہ لوہے کی کنگھیوں سے اُن کی ہڈیوں سے گوشت تک نوچ لیا گیا، ان کو آگ کے گڑھوں میں پھینکا گیا، آرے چلا کر انھیں دو ٹکڑے کر دیا گیا، لیکن وہ لوگ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ کی قسم! میرا مشن مکمل ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک عورت عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جائے گی، اور کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے والا نہیں ہوگا''۔

حاتم طائی، عرب کے مشہور قبیلہ طے کے سردار اور اپنی فیاضی میں مشہور تھے۔ مذہبی اعتبار سے وہ عیسائی تھے۔ ان کے بیٹے عدی بن حاتم تھے۔ وہ کہتے ہیں: ''مجھے سب سے زیادہ اگر کوئی

چیز ناپسند تھی وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کی دعوت تھی۔ جب آپ ﷺ نے میرے قبیلے پر تسلط حاصل کر لیا تو میں بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے جا کر بات تو سننی چاہیے۔ اگر یہ بات اچھی ہوئی تو میرے فائدے کی ہوگی اور اگر غلط ہوئی تو مجھے اس سے کیا نقصان ہوگا، چنانچہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں جب مدینہ میں داخل ہوا تو لوگ پکار اُٹھے کہ عدی بن حاتم آ گئے، عدی بن حاتم آ گئے! لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی، مگر تعجب بھی ہوا کہ یہ کیسے آ گئے؟ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، اپنے ہاں لے گئے۔ مجھے گدیلے پر بٹھایا، خود میرے ساتھ بیٹھے اور فرمایا: ''عدی! اسلام لے آؤ اور مجھے معلوم ہے کہ تم اسلام کیوں نہیں لاتے؟ تم سوچتے ہو کہ یہ مٹھی بھر لوگ جن پر ہر طرف سے دشمن یلغار کیے ہوئے ہیں اور جن کو ہر طرف سے خوف اور جنگ کا خطرہ درپیش ہے، یہ تھوڑے سے لوگ جو مدینہ کے اندر محصور ہیں، یہ دُنیا میں کیا کر سکیں گے؟ لیکن عدی! میں تم کو بتاتا ہوں کہ وہ وقت آنے والا ہے جب صنعا (عرب کے ایک سرے پر واقع تھا، وہاں) سے ایک عورت مکہ تک جائے گی اور بالکل محفوظ ہوگی۔ قیصر و کسریٰ کی بڑی بڑی سلطنتوں کے خزانے تم نے دیکھے ہیں، یہ سب میری اُمت کے ہوں گے۔ اور میں تم کو بتاؤں ایک وقت آئے گا کہ ایک آدمی ہاتھ میں سونا لے کر نکلے گا اور کوئی اس کو لینے والا نہیں ہوگا''۔ عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ تینوں پیش گوئیاں اپنی آنکھوں سے پوری ہوتی دیکھیں۔

جب مٹھی بھر مسلمان مکہ میں تھے اور وہ مارے پیٹے جاتے تھے، ریت پر لٹائے جاتے تھے، انھیں پتھروں سے مارا جاتا تھا، اس وقت جو کلمہ حضور ﷺ کی زبان پر تھا وہ یہ تھا کہ لوگو! لا الٰـہ الا اللّٰہ کہو تو عرب و عجم تمھارے قدموں میں ہوں گے۔ سفرِ ہجرت کے موقع پر جب آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، سراقہ آپ ﷺ کے قریب پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''سراقہ! ایک دن آئے گا کہ کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے''۔ اگر تاریخ کے عام مادی پیمانوں سے ناپا جائے تو یہ جنون کی بات لگتی تھی کہ مکہ میں بیٹھ کر مٹھی بھر آدمی اس بات

کا دعویٰ کریں کہ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں ان کے پاؤں تلے ہوں گی! یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہاں بیٹھ کر کوئی آج یہ دعویٰ کرے کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب امریکہ، روس اور برطانیہ سب ہمارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔ یہ سن کر لوگ کہیں گے کہ یہ پاگل اور مجنون آدمی ہے جو ایسی بات کہہ رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ کی کوئی بھی بات غلط نہیں ہو سکتی اور قرآن مجید نے جس بات کا وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہو کر رہے گا۔ اس پیغام نے ان لوگوں کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ یہ گھڑی تو بہر حال آنے والی ہے۔

قرآن عظیم سے اس تعلّق اور وابستگی کے نتیجے میں اُمت مسلمہ کو جو روحانی ترقی اور اخلاقی بلندی نصیب ہوئی اور ان کے حصّے میں سیرت و کردار کی جو پختگی آئی، وہ نعمت قیصر و کسریٰ تو کیا، دُنیا بھر کی حکومتوں سے زیادہ بیش قیمت تھی اور بالآخر قیصر و کسریٰ کی حکومتیں بھی ان کے قدموں کے نیچے آ گئیں۔ یہ سب اس قرآن مجید سے تعلّق کا فیضان تھا جو دُنیا کی ہر نعمت سے بہتر ہے۔

غور کیجیے، انسان دولت سمیٹے، مکانات تعمیر کرے، محلات بنائے، انڈسٹری لگائے یا اس کے پاس ہزاروں ایکڑ پر مشتمل جاگیریں ہوں مگر یہ سب چیزیں نہ اسے سکون کی دولت دے سکتی ہیں اور نہ آخرت میں کامیابی کی ضمانت فراہم کر سکتی ہیں۔ ہاں، سب سے بہتر اگر کوئی چیز اس نعمت کی ضامن ہے تو وہ صرف قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید کے ذریعے جو نعمتیں آدمی کے حصّے میں آنے والی ہیں، وہ کبھی ختم نہیں ہوں گی، انھیں کوئی زوال نہیں ہے، انھیں کوئی فنا نہیں ہے اور وہ کبھی چھننے والی نہیں ہیں۔

دُنیا بھر کے کارخانے، دولت کے ڈھیر، عالی شان محلات، سرسبز باغات، لمبے چوڑے کھیت، ان کا تعلّق تو انسان سے بس اتنا ہی ہے کہ سانس اندر جاتی ہے اور باہر آتی ہے اور جس دن یہ اندر اور باہر جانا بند کر دے تو یہ سب ہاتھ سے گیا۔ سوال یہ ہے کہ کون سی چیز ہمیشہ ٹھیر سکتی ہے۔ اگر دس کروڑ روپے کا بنک بیلنس بھی کسی کے پاس ہو مگر اس کے جسم میں جان نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے ہاتھ ایک چیک پر دستخط نہیں کر سکتے۔ اگر مکان میں سو کمرے بھی ہوں تو وہ بستر پر

دوبارہ نہیں لیٹ سکے گا۔ اور اگر الماری میں پچاس لباس بھی لٹکے ہوئے ہوں مگر اس لمحے تو صرف دو سفید چادریں ہی اس کا مقدر ہوں گی۔ جو آدمی مال و اسباب سمیٹتا ہے، وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ یہ سب عارضی، فنا ہونے والا اور ختم ہونے والا ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید جو راستہ کھولتا ہے، وہ تو ابدی نعمتوں کا راستہ ہے، جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ جس میں انسان کے لیے کوئی موت نہیں ہے۔ اس کے پھل، درخت اور سائے ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اس کی نعمتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔ جو لوگ اس میں جائیں گے وہ ہمیشہ اس کے اندر رہیں گے (**هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ**)۔

قرآن نے دور اول کے انسانوں کو اس طرح بدل دیا کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر جب آپ یہ بات سوچیں کہ اس نے کیسے بدل دیا تو پھر اپنے بارے میں بھی سوچنا ہوگا کہ ہم کیوں نہیں بدلتے؟

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوتا ہے، اور ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے انسان ہم پہلی رمضان کو تھے، ویسے ہی انسان ہم ۳۰ویں تاریخ کو بھی ہوتے ہیں۔ ہم مہینہ بھر کھڑے ہو کر قرآن مجید سنتے ہیں اور جیسے انسان ہم اس کو سننے سے پہلے تھے، ویسے ہی ہم اس کو سننے کے بعد بھی رہتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کو جو پہلے سننے والے تھے، ان کی کیفیت کے بارے میں تو قرآن کہتا ہے:

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الحج ۲۲: ۳۵)

جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔

تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (المآئدة ۵:۸۳)

تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں، اس لیے کہ وہ حق کو پہچان جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر ۳۹:۲۳)

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں

اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

گویا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کھال سخت پڑ جاتی ہے، دل نرم پڑ جاتے ہیں۔ یہ اثر ان کے جسم پر پڑتا ہے، جو اسے سوچ سمجھ کر، وابستگی اور وارفتگی سے پڑھتے ہیں۔ قرآن ہمارے ہاں اس معاشرے میں آج بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہم اس کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ جلدی جلدی ختم قرآن کی محفلیں بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ مگر کیا، کسی کا دل نرم پڑتا ہے؟ کسی کی آنکھوں میں نمی آتی ہے؟ کسی کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں؟ کسی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جو کلام پڑھا جا رہا ہے، وہ رب السمٰوٰت والارض کا کلام ہے؟ نہیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے جلدی یہ پارہ، یہ منزل اور پھر پورا قرآن ختم ہو۔

اگر تراویح دو منٹ لمبی ہو جائے، تو ہم امام سے کہتے ہیں کہ ''ذرا مختصر کرو، جلدی کرو''۔ اگر کسی فرد کو وزیراعظم، وزیراعلیٰ، گورنر، یا ڈپٹی کمشنر اپنی مجلس میں بلائے تو کیا وہ اتنی ہی بے دلی کے ساتھ ایسے ہی جائے گا؟ اتنی ہی جلدی سے بھاگ آنے کی فکر کرے گا؟ نہیں، بلکہ وہ تو گھنٹوں پہلے جائے گا۔ لباس کو ٹھیک کرے گا، کبھی واسکٹ دیکھے گا، کبھی شیروانی کی کریز دیکھے گا، کبھی ٹائی کی ناٹ دیکھے گا کہ ٹھیک سے بندھی ہے یا بیٹھی ہوئی ہے۔ پہلے سے پہنچ کر انتظار کرے گا۔ اس کے ذاتی معاون سے بار بار پوچھے گا، کب وقت آئے گا اور کب وہ اندر جائے گا۔ یہ تو حال ہے ان کے ساتھ، جو انسان کو کچھ نہیں دے سکتے۔ ان کے ہاتھ میں نفع نقصان پہنچانے کا ذرہ برابر بھی اختیار نہیں۔ لیکن وہ کہ جس کے ہاتھ میں کائنات کا سارا اختیار ہے، ساری قوت اور ساری طاقت ہے، اس سے ہماری بے نیازی کا یہ انداز ہے، اس کے کلام سے ہماری بے رخی کا یہ عالم ہے، کہ نہ ہم اس کو سننا چاہتے ہیں اور نہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ نہ ہم اس کو سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ اس پر غور و فکر کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے پہلے سننے والوں کی جو کیفیت قرآن مجید نے بیان کی ہے، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔قرآن مجید کا جو حصّہ نازل ہوتا، اور ان کی محفلوں میں سنایا جاتا، وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے عمل کرنے کے لیے آرہا ہے۔ یہ محض سننے یا سر دھننے کے لیے نہیں آرہا۔اس لیے وہ اس کے رنگ میں رنگ جاتے، اس کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتے اور ان کی زندگی اس کی تفسیر ہو جاتی تھی۔بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کہتے ہیں: ''ہم نے سورۃ البقرہ دس سال میں ختم کی''۔ لوگ اب یہ چاہتے ہیں کہ شبینہ کی ایک مجلس میں پورا قرآن سن کر ختم کر دیں۔بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کہتے ہیں: ''ہم آٹھ آیتیں سیکھتے تھے، ان کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ان پر عمل کرتے تھے، ان کو محفوظ کرتے تھے۔اس کے بعد ہم اگلی آٹھ آیتیں سیکھتے تھے، اور اس طریقے سے ہی ہم نے پوری سورۃ البقرہ ختم کی''۔اس طرح سے جب انھوں نے قرآن کریم کو جذب کرلیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھ کر ان کی شخصیتیں بدل گئیں تو دُنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کن کن انعامات سے نوازا۔آخرت میں اللہ نے ان سے جن انعامات کا وعدہ فرمایا تھا، سردست اس کا ذکر چھوڑ دیجیے۔اس نے تو دُنیا کے مسائل کے بارے میں بھی یہی کہا ہے کہ وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ o (الاعراف ۷: ۹۶) ''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے'' گویا افلاس، غربت اور پسماندگی کے خاتمے کا نسخہ تو یہی قرآن مجید ہے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم اور بے مثل تحفہ ہے، جو اس نے انسانوں کو عطا فرمایا۔

قرآن کریم کا پہلا حق یہ ہے کہ ہم خود اس کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ہم پر اس کا دوسرا حق یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اسے بیان کریں اور پیش کریں۔جب روشنی آتی ہے تو اس لیے نہیں آتی کہ اس کے اوپر آدمی پردہ اور کمبل ڈال دے۔روشنی آتی ہی اس لیے ہے کہ وہ اپنے

ماحول کو روشن کر دے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس لیے آئی ہے کہ انسانوں کو صحیح راستہ بتائے۔ اس لیے نہیں آئی کہ وہ لپیٹ کر جزدان میں رکھ دی جائے یا ڈرائنگ روم کی شیلف میں سجا دی جائے، یا گاہے گاہے اس کی تلاوت کر لی جائے۔

یہ بات تو اللہ تعالیٰ نے وہیں فرما دی جہاں اس نے رمضان کا ذکر کیا اور روزے فرض کیے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ج (البقرۃ ۲:۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

گویا کہ اللہ فرماتا ہے کہ یہ تو ہم نے تمھارے ہاتھ میں لوگوں کے لیے چراغ تھمایا ہے۔ یہ صرف تمھارے لیے نہیں ہے۔ یہ اُمت اس لیے نہیں بنائی کہ صرف اپنے لیے جیے۔ یہ اُمت تو اس لیے بنی ہے کہ سارے انسانوں کے لیے جیے۔ یہ اُمت نزول قرآن مجید کے ساتھ سارے انسانوں کے لیے کھڑی کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس تو وہ ہدایت ہے جو سارے انسانوں کے لیے چراغِ ہدایت ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ لا اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَo(البقرۃ۲:۱۵۹)

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

یہ کتابِ ہدایت ساری انسانیت کے لیے ہے، مگر جو اسے چھپا کر رکھتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ خود بھی لعنت بھیجتا ہے اور سارے انسان بھی لعنت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس لیے

لعنت فرماتا ہے کہ میں نے اتنی بڑی نعمت ان کے ہاتھوں میں دی ہے، مگر یہ اس سے غافل سو رہے ہیں۔ انسان اس لیے لعنت کرتے ہیں کہ ہم گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، بے شمار روگ اور امراض ہم کو لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے پاس ایک ایسا نسخۂ شفا موجود ہے، جس سے ہمارا علاج ہوسکتا ہے، وہ روشنی موجود ہے جس سے ہماری زندگی کی تاریک راہیں روشن ہوسکتی ہیں، لیکن یہ عجیب لوگ ہیں کہ یہ نسخہ بھی اپنی جیب میں رکھے بیٹھے ہیں اور چراغ کے اوپر بھی انھوں نے کمبل ڈال رکھا ہے۔ وہ لعنت نہ کریں تو کیا کریں۔ پھر فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ o اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَهُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَo (البقرۃ ۲:۱۶۰۔۱۶۱)

البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِعمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کردوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا (قرآن کی ناشکری کی) اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اندازِ بیان دیکھیے، اس کی شدت دیکھیے، اس میں ناراضی اور غضب کی جھلک دیکھیے: ان پر اللہ کی لعنت، جس نے کتاب دی۔ ان پر فرشتوں کی لعنت جنھوں نے کتاب پہنچائی اور انسانوں کی جانب سے بھی لعنت کہ جن کے لیے کتاب لائی گئی تھی۔

یہ کتاب جہاں نعمت ہے وہاں ایک امانت بھی ہے۔ یہ نعمت اور امانت اللہ تعالیٰ نے ہمارے سپرد فرمائی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم اس نعمت اور امانت کا حق ادا کررہے ہیں؟

اس کتاب نے ہم سے پہلے آنے والوں کی زندگیاں بدل دیں۔ ذرا سوچیں کہ کس طرح بدل دیں؟ سوال یہ ہے کہ آج ہمیں اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے؟

جب یہ کتاب نازل ہوئی، تو کتاب کے سننے والوں کو اس میں بیان کردہ ہر بات پر مکمل

یقین تھا، وہ انھیں محض زبان سے کہے ہوئے الفاظ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ اپنے شعور کی اعلیٰ ترین سطح پر اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اس کا ایک ایک لفظ اللہ کی طرف سے ہے۔ جس طرح اگر آج اخبار میں کوئی بڑا اہم اعلان آ جائے کہ جس کا روز مرہ زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہو تو ہر آدمی اس خبر کا پوچھے گا۔ کوئی نیا قانون آ جائے تو آپ یہ جاننے کے لیے بے چین اور مضطرب ہو جائیں گے کہ حکومت کی طرف سے کیا نیا قانون آ گیا؟ مگر میرے عزیزو! ان لوگوں کے لیے تو حکومت ایک ہی تھی، **لہ ملك السموت والارض**، آسمان وزمین کی حکومت اسی خالق و مالک کے لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کی طرف سے جو اعلان آتا تھا، وہ ان کے سر آنکھوں پر ہوتا تھا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ''ایک حبہ بھی اللہ کی راہ میں دو گے تو جان لو سات سو گنا یقینی ہے، اس سے زیادہ ہم دیں گے'' ان کو اس بات پر یقین ہوتا تھا۔ اللہ کی راہ میں مقدور بھر دینے کے بعد ان کی جیب بند نہیں رہتی تھی۔ لوگ اپنے ہزاروں درہم و دینار لا کر لٹا دیا کرتے تھے۔ اپنے قیمتی باغ اللہ کی راہ میں دے دیا کرتے تھے۔ مزدوری کرتے تھے اور پیسے لا کر آنحضور ﷺ کے قدموں میں رکھ دیتے تھے۔ اگر ان کو اس بات کی خوش خبری دی جاتی کہ اللہ کی راہ میں گردن کٹا دو گے تو سیدھے جنت میں جاؤ گے تو لوگ اپنے ہاتھوں سے کھجور پھینک دیتے تھے کہ اب ان کھجوروں کے ختم ہونے کا انتظار بھی کیوں کریں۔ غزوۂ بدر کا واقعہ ہے، آنحضور ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران ۳:۱۳۳)

دوڑو، مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت میں آسمان و زمین سما جائیں گے۔

ایک نوجوان لڑکا وہاں کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا: ''حضور ﷺ! کیا میں بھی جنت میں جا سکتا ہوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں؟''...... راستہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔

آج ہمارے لیے کوئی جنت کے ہزار راستے کھول دے، لیکن ہمارے قدم اس راہ کی طرف نہیں اٹھتے۔

لیکن وہاں پر تو ایمان ویقین تھا۔ ان صحابی کے ہاتھ میں کھجوریں تھیں۔ کہنے لگے: ''اتنی دیر کون انتظار کرے کہ کھجوریں ختم ہوں''۔ سبحان اللہ، اتنا یقین تھا انھیں اپنے رب کے وعدے پر! آنحضورﷺ کے وعدے اور قرآن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے انھوں نے کھجوریں ہاتھ سے پھینک دیں، تلوار نکالی، لڑے اور شہید ہوگئے۔ یہ عمیر بن حمام رضی اللہ عنہ تھے۔ آج کتنے لوگ ہیں کہ ہاتھ اور دامن کھجوروں سے بھرے ہوئے ہیں، مگر انتظار کر رہے ہیں کہ ذرا یہ کام ہوجائے، ذرا وہ کام ہوجائے، پھر ہم نیک بن جائیں گے۔ ذرا یہ بیوی بچوں کا مسئلہ سلجھ جائے تو پھر ہم اللہ کے دین کا کام کریں گے۔ جس طرح دکھائی دینے والی کل کبھی نہیں آتی، اسی طرح نیکی کا راستہ ٹالنے پر کبھی صراط مستقیم نہیں ملا کرتا، اور پنڈلی سے پنڈلی لگ جاتی ہے، اور قبر کا گڑھا اس فرد کو اپنی وحشت خیز تنگنائیوں کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ان کھجوروں کو ہاتھوں میں لیے ہم انتظار کرتے ہیں اور برسوں انتظار کرتے ہیں۔ جنت کا راستہ ہمارے سامنے کھلا رہتا ہے، لیکن ہم اس پر نہیں چلتے۔ اس کے مقابلے میں قرآن مجید نے ان کے دلوں میں ایمان کو اتار دیا۔ اسی لیے آیات سن کر ان کے دل کانپ اٹھتے تھے، لرز اٹھتے تھے، کپکپا جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ یہ چیز ایک زندہ حقیقت کے طور پر ان کی زندگی میں تھی۔ ان کے لیے قرآن مجید کوئی آبا واجداد کی کتاب نہیں تھی۔ کوئی ورثہ نہیں تھا جو ماں باپ کی طرف سے منتقل ہوا ہو۔ وہ تو اپنی آنکھوں سے اس کو اترتا دیکھ رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، آسمانوں اور زمین کے رب کی طرف سے ہے اور ایک حقیقت کے طور پر اس کے ایک ایک لفظ پر انھیں یقین تھا۔

اللہ کے رسولﷺ نے ان کا تعلّق رب کے ساتھ جوڑا اور وہ اس کے بندے بن گئے۔ اسی کے ہوگئے، اسی کے ہو رہے اور اپنا سب کچھ اسی کے حوالے کر دیا۔ اللہ کے رسولﷺ

نے ان سے فرمایا: ایمان لانے کی نشانی یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر محبت اللہ سے ہونی چاہیے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ ۲:۱۶۵)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

اللہ سے محبت کرنا صرف اولیا اللہ کا مقام نہیں ہے۔ اللہ سے محبت رکھنا تو ہر مومن کا مقام اور اس کے ایمان کی نشانی ہے۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو سب رشتوں اور تمام چیزوں سے بڑھ کر اللہ سے محبت ہوگئی تھی۔ اس محبت سے بڑھ کر نہ باپ تھا، نہ ماں تھی، نہ بیٹا تھا، نہ بچے تھے، نہ دولت تھی اور نہ جایداد تھی۔ یہ سب چیزیں موجود تو تھیں، اور ان سے تعلّق بھی تھا، پھر وہ دُنیا کو چھوڑ کر کسی گوشے میں جا کر نہیں بیٹھ گئے تھے۔ اس دُنیا پر دو حرف بھیج کر کہیں جنگلوں میں نہیں نکل گئے تھے۔ لیکن اس دُنیا اور معاشرے میں رہنے کے باوجود، انھیں سب سے بڑھ کر محبت اللہ سے تھی۔ اس کی صحبت میں وقت گزارنے کی خاطر وہ نماز کے لیے لپکتے ہوئے آتے تھے۔ اس کی محبت میں مال دُنیا نچھاور کرتے تھے۔ جان دینے کا وقت آتا تو گردن کٹا دینے کے لیے اُمڈتے چلے آتے تھے۔ جب حکم آیا کہ شراب حرام ہے تو شراب کا جام اگر کسی کے منہ سے لگا ہوا تھا تو اس نے جام و سبو کو اسی لمحے توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ سب کچھ محبت کا نتیجہ تھا۔ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ اس کی کیفیت اور ماہیت کو کوئی بیان نہیں کر سکتا، لیکن ہر فرد کو کسی نہ کسی چیز سے محبت کا تجربہ ضرور ہوتا ہے۔ جب محبت ہوتی ہے تو پھر اس کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھیرتی۔ اگر سب سے بڑھ کر محبت اللہ سے ہو جائے تو اس کے آگے کس کی محبت ٹھیرے گی! اللہ سے بڑھ کر محبت کسی اور چیز سے آخر ہو بھی کیسے سکتی ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ وہ اپنی قوم سے گفتگو کر رہے تھے۔ ستارے دکھائی دیے تو کہا کہ یہ رب ہیں۔ لیکن ستارے ڈوب گئے۔ فرمایا: لا احب الآفلین' جو ڈوبنے والے ہیں ان کو میں محبُوب نہیں رکھتا۔ پھر چاند نکلا تو کہا کہ یہ تو اس سے بھی بڑا ہے، یہ میرا محبُوب ہے۔ لیکن چاند بھی ڈوب گیا۔ سورج نکلا تو کہا کہ یہ تو سب سے بڑا رب ہے۔

سورج بھی ڈوب گیا، فرمایا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ o (الانعام ۶:۷۹)

اب تو میں نے اپنا رخ بس اس کی طرف کر لیا جو آسمان اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں ہر طرف سے کٹ گیا۔

حنیف کے معنی ہر طرف سے کٹ کے بس ایک ہی کا ہو رہنے والے کے ہیں۔ **وما انا من المشرکین** اور اب میرا رخ جس کی طرف ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ زندگی میں جانے کتنے ستارے، کتنے چانداور کتنے سورج ہیں جن پر ہماری نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہمیشہ رہیں گے۔ **الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ o (الھمزہ ۱۰۴:۲)** مال کو جمع کرتا ہے، گنتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے بعد بھی رہے گا، ہمیشہ باقی رہے گا۔ لیکن چاند بھی ڈوب جائے گا، سورج بھی ڈوب جائے گا، اور ستارے بھی ڈوب جائیں گے۔ ان ڈوبنے والی چیزوں سے محبت سے کیا حاصل؟ انسان محبت کرے تو اس سے کرے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط (القصص ۲۸:۸۸)

ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔

كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ o وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ o (الرحمن ۵۵:۲۷)

ہر چیز فنا ہونے والی ہے، صرف ایک چیز ہے تمھارے رب کا، چہرہ اکرام وجلال والا جو باقی رہے گا۔

وہ اس کا چہرہ ہے جو ہلاک نہیں ہوگا۔ پھر آدمی ان چیزوں سے کیوں محبت کرے جو آج ہیں اور کل نہیں رہیں گی۔ انسان محبت کرے تو اسی چیز سے کرے جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جنت کے ایسے طلب گار تھے جیسے کہ جنت ان کی نگاہوں کے سامنے ہمیشہ ہو۔ ان کے لیے جنت اور دوزخ کوئی مولوی کا وعظ نہیں تھا۔ وہ تو جنت اور دوزخ کو دن رات اپنی مجلسوں میں اس طرح سنتے اور دیکھتے تھے، گویا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ ان کو اس بات پر یقین تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم یہ کریں گے تو جنت میں جائیں گے اور وہ کریں گے تو دوزخ میں پہنچیں گے۔ حرام مال اگر پیٹ میں جائے گا، تو بظاہر بڑا لذیذ محسوس ہوگا لیکن یہ تو انگارہ ہے، جو ہم پیٹ میں بھر رہے ہیں۔ وعدہ خلافی میں بظاہر بہت نفع ہوتا دکھائی دے گا، لیکن یہ تو آگ ہے جو ہم اپنی زبان کے اوپر رکھ رہے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ کے بندوں کی خدمت کریں گے، اللہ کی اطاعت کریں گے تو جنت کے باغات ہیں، کیاریاں ہیں اور محلات ہیں، جو ہمارے حصّے میں آئیں گے۔ قرآن مجید کے تو اکثر حصّے جنت اور دوزخ کے احوال پر مبنی ہیں۔ جگہ جگہ جنت کی منظر کشی اس طرح سے کی گئی ہے کہ یہ محلات ہیں، یہ انواع واقسام کے کھانے ہیں، یہ پرندوں کا گوشت ہے، یہ فواکہات ہیں، یہ ساتھی ہیں، یہ صحبتیں ہیں اور یہ مجلسیں ہیں...... یہ سب ان کے لیے حقیقت تھی اور وہ چشم تصور میں انھیں دیکھتے تھے۔ دوزخ کا ذکر ہوتا تھا کہ یہ آگ کے ہتھوڑے ہیں، یہ گرم پانی ہیں، یہ گرم کھانا ہے، یہ انگاروں کا بستر ہے......اور یہ منظر بھی ان کے لیے مجسم حقیقت بن کر سامنے آتا تھا۔

کس نے ان کو وہ قوت بنا دیا کہ قیصر و کسریٰ بھی ان کے آگے زیر ہو گئے؟ ایک مستشرق کے الفاظ میں: ''وہ مکہ کا یتیم بچہ جس کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسی (۸۰) سال کے بعد اسپین سے لے کر چین تک، وادیوں میں، صحراؤں میں، جنگلوں میں، شہروں میں اس کا نام پکارا جانے لگا''۔ یہ سب کن لوگوں نے کیا؟ یہ ان لوگوں نے کیا، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر پورا پورا یقین اور ایمان تھا، جن کو اللہ کی کتاب پر ایمان رکھنے کی دولت حاصل تھی۔ اس کتاب نے ان کو اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ جب وہ بدل گئے تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سارے وعدے پورے ہو گئے۔

اسی طرح جب ہم نے اس کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا تو اس کے سارے وعدے ہمارے ساتھ بھی پورے ہوئے۔ کبھی ہم پر منگول مسلط کیے گئے اور کبھی ہم پر یورپی مسلط کیے گئے۔ ہماری عزت، دولت، علمی نوادر اور مالی خزانے سب غیروں کے پاس چلے گئے۔ یہ سب کس لیے ہوا؟ اس لیے نہیں ہوا کہ ہم کمزور تھے یا ہمارے پاس اسلحہ کم تھا۔ عرب اسرائیل جنگ جو ۵ جون ۱۹۶۷ء کو ہوئی، وہ صرف چار پانچ روز تک لڑی گئی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ عربوں کے پاس کئی گنا زیادہ فوج تھی۔ جنگی طیارے اسرائیل سے کئی گنا بڑھ کر تھے۔ مگر ہوائی جہاز میدان میں کھڑے کھڑے تباہ ہو گئے۔ میزائل کی بیس [base] جنرل نے خود اسرائیل کے حوالے کر دی۔ کئی گنا زیادہ مسلمانوں کی تعداد مٹھی بھر یہودیوں سے شکست کھا گئی۔ اس زمانے میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ''قرآن میں تو لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ہمیشہ کے لیے ذلت اور مسکنت مسلط کر دی ہے، مگر یہ یہودی کیسے فاتح ہو گئے؟''

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رشتہ نہ بنی اسرائیل سے ہے اور نہ ہمارے ساتھ۔ اس کا رشتہ تو ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ ہے۔ جب اس نے یہودیوں کو معزول کر دیا اور اُمتِ مسلمہ کو اس مقام پر کھڑا کر دیا، تو مسلمان اللہ کی کتاب اور اس کی دعوتِ توحید کے علم بردار بن گئے۔ جب مسلمانوں نے اس سے بے پروائی برتی تو ذلت و مسکنت ان پر مسلط کر دی گئی۔ ان سے اسی طرح سے معاملہ ہوا جیسے عام طور پر ہمارے معاشرے میں کوئی ملازم کسی مالک سے بے وفائی کرے، تو محلے کے چمار کو کھڑا کر کے اس کو جوتے مارے جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے یہودیوں کے ذریعے ہم کو جوتے لگوائے کہ دیکھو تمھارا کیا مقام تھا اور آج تم اتنے ذلیل ہو۔ اُمت مسلمہ کو اس ذلت و پستی کا سامنا کیوں ہے؟ اس لیے کہ قرآن مجید نے جو نعمت ہمارے حوالے کی ہے اور جو امانت ہمارے سپرد کی ہے، ہم اس کا حق ادا نہیں کر رہے۔ اس سے بے تعلقی اور بے گانگی کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اللہ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ ہماری عظمت و سربلندی کے سارے خزانے اسی

میں پوشیدہ ہیں کامیابی کی ساری کنجیاں اسی کے دامن میں ہیں، کامرانی کے سارے دروازے اسی کے اندر ہیں۔فوز وفلاح، نجات، سکون اور مغفرت کا اس کے باہر کوئی دروازہ نہیں ہے۔ ہم روز صبح اخبار پڑھتے ہیں اور قوم کی حالتِ زار پر روتے اور مرثیہ پڑھتے ہیں۔لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ صرف ایک ہی نسخہ ہے جو ہمارے ملی اور قومی امراض کا علاج ہے اور وہ ہے قرآن مجید!

ہمارے امراض کی جڑ کیا ہے، ہمارے امراض کی جڑ تو ہمارے دلوں میں ہے۔قرآن مجید نے کہا ہے:فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ،مرض کی جڑ تو دلوں کے اندر ہوا کرتی ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ٥

(الحج ۲۲:۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

بظاہر آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ دل ہیں جو اندھے ہو جاتے ہیں۔آج سیاست دان ہوں یا تاجر، بیوروکریٹس ہوں یا پھر بھائی بھائی کا خون بہانے والے، یہ سب خوب جانتے ہیں، کیا برا ہے اور کیا اچھا ہے۔کسی کے علم میں کمی نہیں ہے، کسی کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں، سب کو دکھائی دے رہا ہے کہ یہ برے کام ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ برے کام کرتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔یہ اس لیے ہے کہ ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں جو ان کے سینوں کے اندر ہیں۔ اور جب یہ کیفیت ہو جائے تو علاج پھر اسی کے پاس ہے جو شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، وہ سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے، وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اَلَا وَهِيَ الْقَلْب، سن لو، جان لو کہ یہ دل ہے جو تمھاری شخصیت کا مرکز ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں لالچ، حرص، محبت، نفرت، جذبات اور محرکات سب جمع ہیں۔کہا جا سکتا ہے کہ ایک چھوٹی سی چیز کے بننے بگڑنے

سے زندگی کیسے بن بگڑ سکتی ہے؟ آج کل کینسر کا مرض بڑا عام ہے۔ آدمی کے جسم کے اندر اربوں خلیے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اگر صرف ایک خلیہ بگڑ جائے تو یہ موت کا وارنٹ ثابت ہوتا ہے۔ یہ کینسر کی علامت ہے۔ اس کے بعد کوئی مادی سہارا انسانی جان نہیں بچا سکتا۔ گویا بیماری کی جڑ صرف ایک خلیے سے شروع ہو سکتی ہے۔

درحقیقت دل سب سے اہم عضو ہے۔ اس میں اللہ کی محبت، رسول ﷺ کی محبت، قرآن کی محبت پیدا ہو سکتی ہے اور اس سے بے رخی خسران کا طوفان لا سکتی ہے۔ دل کی حالت کی بہتری کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ ہم کچھ کرنے کا ارادہ کر لیں، جب ہم کچھ کرنے کا ارادہ کر لیں گے، تو ہماری حالت بھی سنبھلے گی اور قوم کی حالت بھی بہتر ہوگی۔ آج اگر اس بات کا ارادہ کر لیا جائے کہ ہمیں اللہ کی کتاب کو سمجھنا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے، تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو اللہ تعالیٰ اپنے نور اور رحمت سے بھر دے۔ انھوں نے اور ان کی اولاد نے جو خدمت دین کی ہے اس کی وجہ سے آج اردو زبان میں قرآن مجید کے بڑے مستند اور صحیح ترجمے موجود ہیں۔ آپ کوئی ترجمہ لے لیں اور یہ ارادہ کر لیں کہ چوبیس گھنٹے کا دن جسے آپ کاروبار، روزگار اور بیوی بچوں میں لگاتے ہیں، اس میں سے پانچ منٹ، روزانہ اس بات پر لگائیں گے کہ قرآن مجید کی صرف تین آیات ترجمے سے پڑھ لیں یا اگر پڑھنا نہ جانتے ہوں تو کسی سے سن لیں۔ اس طرح چار پانچ سال میں پورا قرآن مجید ختم ہو جائے گا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، اگرچہ آج یہ کام بہت مشکل لگتا ہے کہ پورا قرآن پڑھا جائے لیکن ارادے سے اور عزم سے، تہیہ کر کے روزانہ پانچ منٹ میں صرف تین آیات قرآنی اس طرح پڑھی جائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بات چیت کر رہا ہے تو چند ہی روز میں اس کی لذت اور اس کا کیف آپ کو خود ابھارے گا کہ آپ اس کو ڈوب کر پڑھیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ **احیاء العلوم** میں ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”پہلے

میں قرآن مجید اس طرح پڑھتا تھا گویا کہ میں خود پڑھ رہا ہوں۔ اس میں مجھے کچھ مزا نہ آتا تھا۔ پھر میں نے اس طرح پڑھنا شروع کیا کہ گویا نبی کریم ﷺ سے سن رہا ہوں تو میرا لطف دوگنا ہو گیا۔ پھر میں نے اس طرح پڑھا کہ جبرائیل امین علیہ السلام خود مجھ سے مخاطب ہیں، اور یہ کلام سنا رہے ہیں، پھر تو کیا کہنے، اور آخر میں، میں نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ خود مجھ سے کلام فرما رہا ہے۔ اس وقت مجھے قرآن مجید کا اصل مزا آیا۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب ہمارے لیے اتاری ہے۔ وہ ہم سے بار بار کہہ رہا ہے کہ میں نے تمھارے لیے یہ کتاب اتاری ہے۔ وہ ہم سے کلام کر رہا ہے۔ اگر ہم روزانہ اس کے کلام کے ساتھ صرف پانچ منٹ صرف کر دیں، اس کی صحبت میں لپک کر جائیں اور ارادہ کر لیں کہ روزانہ کم از کم تین آیتیں پڑھیں گے اور اس کے مطابق اپنی زندگی بنانے کی کوشش کریں گے تو پانچ سال میں قرآن مجید مکمل پڑھا جائے گا اور یہ بڑا کام ہو جائے گا۔ اگر قرآن مجید کا مفہوم اور ترجمہ اس قوم کے ہر فرد تک پہنچ جائے، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی حالت نہ بدل جائے۔

دوسری بات یہ کہ اگر ہم اپنے وقت میں سے رات یا صبح کسی بھی وقت پانچ منٹ نکال لیں اور اس دوران بیٹھ کر یہ سوچیں کہ آج ہم نے کون سا ایسا کام کیا ہے، جو ہمارے اللہ کو ناراض اور ناخوش کرنے والا تھا۔ بس اپنے آپ سے اتنا پوچھ لیں اور کچھ نہ کریں۔ اس سوال کا جواب خود آپ کے دل پر اس طرح نشتر چلائے گا کہ آپ کی حالت بہتر ہوتی چلی جائے گی۔ چاہے آپ بالکل اصلاح نہ کریں، لیکن روز اپنے آپ سے پوچھیں کہ میں نے آج وہ کون سے کام کیے، جو میرے اللہ کو ناخوش کرنے والے ہیں اور جو مجھے آخرت میں جہنّم میں لے جائیں گے۔ اگر اس سے آگے بڑھ کر آپ اصلاح کے لیے کوئی عملی قدم نہ اٹھائیں، یہ جائزہ و احتساب بذاتِ خود آپ کی اصلاح کا پروگرام ثابت ہوگا۔ لیکن محض آپ کی اصلاح سے بات نہیں بنے گی۔ یہ کتاب آپ کو اس لیے دی گئی ہے کہ آپ اسے لے کر کھڑے ہوں، اور اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اس کے لیے اپنا وقت لگائیں اور اس کتاب کے مطابق اپنی زندگی

بسر کریں۔ یہ اللہ کی کتاب کا آپ پر حق ہے اور خاتم الانبیاﷺ کی پوری زندگی اسی حق کو ادا کرتے ہوئے گزری ہے۔

''سنت'' اور ''حدیث'' کی تعریف سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ ہمارے محدثین کے مطابق حدیث کی تعریف یہ ہے کہ وہ کام جو اللہ کے رسولﷺ نے کیا یا وہ بات جو آپﷺ نے کہی یا وہ بات اور کام جو آپﷺ کے سامنے کیا گیا اور آپﷺ نے اسے اچھا کہا یا اسے دیکھ کر آپ خاموش رہے۔ یہ ''حدیث'' کی فنی تعریف ہے جو محدثین کرتے ہیں۔ یہ بھی سنت ہے کہ ہمارا لباس ایسا ہو، ہمارے چہرے پر داڑھی ہو۔ کبھی غور کیجیے، غارِ حرا سے لے کر اس وقت تک، جب آنحضورﷺ نے اپنی جاں جان آفریں کے سپرد کی، اس وقت تک آپﷺ کا دن رات کس کام میں صرف ہوتا تھا؟ سب سے بڑی سنت کیا تھی؟ یہی کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی دعوت پہنچانا۔ پھر آپﷺ صبح شام، رات دن، مکہ کی گلیوں اور طائف کی وادی میں، مدینہ اور مسجد نبویﷺ میں، اپنے حجرے کے اندر بیٹھ کر، میدانِ جنگ میں فوجیں لے جا کر، کیا کام کر رہے تھے؟ آپﷺ صرف اللہ کے دین کی دعوت پہنچا رہے تھے اور اس کے لیے جہاد کر رہے تھے۔ اس عمل کے بغیر قرآن کا کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس عمل کے بغیر رسول اللہﷺ سے محبت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

اگر ہم نے یقین اور ایمان سے قرآن کے ساتھ معاملہ کیا تو ایک ایک فرد کے، پوری قوم کے اور اُمت مسلمہ کے تمام مسائل اس طرح حل ہو جائیں گے کہ جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھے۔ ورنہ یہ مسائل ہمارے سر پر مسلط رہیں گے، زندگی اسی طرح ایک عذاب بنی رہے گی، اور اسی عذاب میں ہم سب زندگی بسر کرتے رہیں گے۔

یہی قرآن کا پیغام ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❖❖❖